تحقیق و بحث

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

# روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ!

کچھ عرصہ قبل راقم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں "روح" سے متعلق چند امور زیرِ بحث آئے تھے۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے مجھے دو حضرات کی طرف سے یہ سوال نامے موصول ہوئے ہیں۔ پہلے سائل جناب عبدالقادر صاحب سومرو کراچی سے لکھتے ہیں کہ:

"مکرمی جناب کیلانی صاحب،

آپ نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ:

"اور سماعِ موتیٰ اس لیے ناممکن ہے کہ جو روحیں جسم چھوڑ کر "علیین" یا "سجین" میں مقید ہیں وہ واپس دنیا میں نہیں آ سکتیں۔ اور نہ ہی شہداء کی وہ روحیں دنیا میں واپس آ سکتی ہیں جو براہِ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں!"

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ سماعِ موتیٰ ناممکن ہے۔

۲۔ مرنے کے بعد ارواح کا دوبارہ جسموں میں آنا ناممکن ہے۔

اور پورا قرآن و احادیثِ صحیحہ اس پر گواہ ہیں کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے اس جسم میں روح نہیں آ سکتی۔ لیکن دوسری طرف مولانا سیف الرحمٰن الفلاح نے اپنے ایک مضمون میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

"ہجرت کرنے والی مومن عورت کی دعا سے اللہ نے اس کے بیٹے کو دوبارہ زندہ کیا۔"

پھر جب ہم نے شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ کی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" اور "کتاب الوسیلہ" کا مطالعہ کیا تو عقل حیران رہ گئی کہ صرف یہی نہیں کہ مردہ دوبارہ زندہ ہو گیا، بلکہ اس نے راوی کے

ساتھ کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد جب غور سے دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا تو ذہن بڑی اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ آج تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ ان نظریات اور عقائد کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ لیکن ان کتابوں میں تو انھوں نے اِن تمام باتوں کو مان کر سند دے دی جو آج کفر و شرک کی بنیاد ہیں۔

شیخ الاسلام دونوں کتابوں "اقتضاء الصراط المستقیم" اور "کتاب الوسیلہ" میں لکھتے ہیں:

۱۔ "جب کوئی شخص کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے، جسے وہ دنیا میں جانتا تھا اور اس پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی رُوح اس میں لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے!"

(کتاب الوسیلہ صفحہ ۲۳، اردو ترجمہ اسلامی اکادمی لاہور۔ اقتضاء الصراط المستقیم، اردو ترجمہ مجلس نشریات اسلامی کراچی)

۲۔ "اُس باب میں ان روایات سے یہاں بحث نہیں جن میں آنحضورؐ پر سلام کا جواب سُنا گیا ہے یا یہ کہ سعید بن المسیب نے واقعہ حرّہ کی راتوں میں قبر شریف سے آتی ہوئی اذان سنی تھی۔ یہ سب صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ہو سکتا ہے"!

(اقتضاء الصراط المستقیم صفحہ ۱۶۱۔ اردو ترجمہ)

۳ "بہر حال میّت کا قرآن اور دوسری آوازیں سُننا تو حق ہے، لیکن مرنے کے بعد عمل پر اُسے کوئی ثواب نہیں ملتا ہے۔ لیکن مُردہ اپنے قریب کئے جانے والے معاصی سے پریشان ضرور ہوتا ہے"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۱۶۱)

محترم! یہ چند سوالات آپ کو بھیج رہا ہوں، اس پر کتاب اللہ اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں تبصرہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ والسلام!

دوسرے سائل محمد احسان الحق صاحب یدوخیل میانوالی (حال اسلام آباد) سے لکھتے ہیں کہ:

"محترم! ایک عرصہ سے میرے ذہن میں مسئلہ عذابِ قبر کے متعلق اُلجھن اور خلفشار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عذابِ قبر حق ہے۔ قبر منازلِ آخرت میں سے ایک بلکہ پہلی منزل ہے۔ اس منزل سے کامیاب گزرنے والا آخرت میں بھی کامیاب ہو جائے گا اور جو یہاں پکڑا گیا اُس کی آخرت کی بھی خیر نہیں۔ عذابِ قبر کے بارے میں مجھے جو اشکال ہے اُس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ زندگی موت کی ضد ہے۔ جب رُوح جسم میں پڑتی ہے تو جِلا ملتی ہے اور جب نکال لی جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر یوم البعث کو یہ رُوح دوبارہ جسم میں آئے گی تو انسان

زندہ ہو گا۔ دُنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی کے درمیان ایک مرحلہ ہے، جسے برزخ کہتے ہیں، اسے برزخی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ زندگیاں تو ازرُوئے قرآن دو ہیں اور موتیں بھی دو، تو یہ برزخی زندگی کیا ہے؟

۲۔ عذابِ قبر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا تعلق رُوح سے ہے؟ بعض مشائخ سے سنا ہے کہ رُوح کا عکس جسم پر رہتا ہے لہٰذا جسم کو بھی اذیت پہنچتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو حساب کا کیا مطلب؟

۳۔ "فَیُعَادُ رُوْحُہٗ فِیْ جَسَدِہٖ" کا کیا مفہوم ہے؟ نصوصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ جب رُوح اور جسم ملیں گے تو انسان فوراً اُٹھ کھڑا ہو گا۔ جیسے سورہ یٰس میں ہے: "وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا ھُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ"

۴۔ کُتبِ حدیث میں ہے کہ جب مُردے کو دفن کر کے لوگ واپس ہوتے ہیں تو وہ اُن کے جُوتوں کی آواز سُن رہا ہوتا ہے کہ اُس کے پاس منکر اور نکیر آجاتے ہیں۔ جب رُوح جسم سے نکل جاتی تو حواسِ خمسہ بھی جاتے رہتے ہیں پھر وہ کس طرح سُنتا ہے؟ قرآن بھی تو کہتا ہے: "اَمْ لَھُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا"

۵۔ مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ اپنی تصنیف "الادلۃ القویۃ علی ان حیٰوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ لیست بدنیویۃ" میں ص ۵۲ پر بحوالہ "کتاب الروح" (از ابن قیمؒ) فرماتے ہیں:

> "برزخ کا تعلق۔ اس میں گو علیحدگی ہو جاتی ہے لیکن تجرّدِ کلی نہیں ہوتا بلکہ سلام کے جواب کے لیے اُسے لوٹایا جاتا ہے۔ لیکن یہ دنیوی زندگی نہیں ہوتی جو اُسے قیامت سے پہلے حاصل تھی۔"

۶۔ حدیث میں آتا ہے کہ مومن بندہ پر (جب وہ ٹھیک جواب دیتا ہے تو) قبر حدِ نظر تک فراخ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کافر پر قبر تنگ ہو جاتی ہے اُسے بھینچ لیتی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ایک صحابی رسولؐ پر قبر تنگ ہو گئی؟

۷۔ جب ازرُوئے قرآن مُردہ نہیں سُن سکتا (وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ) تو صیغہ حاضر اور حرفِ ندا کے ساتھ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ" کیوں کہتے ہیں؟

۸۔ کتاب الروح (از ابن قیم) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

محترم! نصوصِ صریحہ کی روشنی میں میرے اِن اشکالات کا تدارک فرمائیے!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ!

# الجواب بعون الوهاب

رُوح کے متعلق بحث ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ خلاقِ عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ:

"وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا" (بنی اسرائیل: ۸۵)

"اور تمہیں روح سے متعلق تھوڑا ہی علم عطا کیا گیا ہے"

جس کا واضح مطلب ہے کہ رُوح کی حقیقت اور کنہ تک پہنچنا انسان کے لیے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لیکن انسان کی عادت ہے کہ جس بات سے متعلق اس پر بندش عائد کی جائے، وہ اس بات کی کرید و تفتیش میں دوسری باتوں سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دیتا ہے! ایسا ہی ایک مسئلہ تقدیر کا تھا جس پر بحث کرنے سے صراحتاً روکا گیا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر حضرت انسان نے اپنی تحقیق و تفتیش سے وہ وہ گل کھلائے کہ اسی مسئلہ میں اختلاف کی بنا پر اُمّتِ مسلمہ کے دو فرقے پیدا ہو کر آپس میں متحارب ہو گئے۔ رُوح کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چنانچہ اس پر بھی جن جن علماء نے قلم اٹھایا ہے، ان کی تفاصیل میں بہت اختلاف واقع ہوا۔ محولہ بالا مضمون میں میں نے رُوح سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اب کچھ تفصیل پیشِ خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## زندگی اور موت کے چار مراحل:

جسم اور رُوح کے انفصال کا نام موت اور اتصال کا نام زندگی ہے۔ عام ضابطہ الٰہی کے مطابق دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی کا ذکر قرآنِ کریم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ پہلے موت ہے پھر زندگی، پھر موت ہے پھر زندگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ

ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿البقرۃ: ۲۸﴾

"تم خدا سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟ اس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مارتا ہے پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔"

اور قیامت کے دن کفار بھی یہی اقرار کریں گے کہ:

"قَالُوا رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ؟" (المؤمن: ۱۱)

"کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم کو دو بارہ موت دی اور دو بارہ زندہ کیا ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ تو کیا اب (جہنم کے عذاب سے) نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟"

آپ نے دیکھا کہ ان دونوں مقامات پر اللہ تعالیٰ نے زندگی سے پہلے موت کا ذکر کیا ہے زندگی کی طرح موت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو زندگی سے پہلے پیدا کی گئی۔ گویا موت محض عدم یا کسی سلبی چیز کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایجابی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات سے پہلے پیدا کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا" (الملک: ۲)

"اسی نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے؟"

## پہلا مرحلہ موت ہے

**رُوحوں کی پیدائش کب ہوئی؟**

پہلا مرحلہ موت ہے اور اس سے مراد وہ دَور ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کرنے کے بعد ان تمام رُوحوں کو بھی پیدا فرمایا، جو اس کی پشت سے تا قیامت پیدا ہونے والی تھیں، "عہدِ اَلَستُ" اسی دَور سے متعلق ہے۔ (الاعراف: ۱۷۲) اور یہ دَور رُوح کی پیدائش سے لے کر اس کے شکمِ مادر میں جنین کے جسم میں داخل ہونے تک پھیلا ہوا ہے، رُوح اگرچہ ایک زندہ و متحرک اور عقل و شعور رکھنے والی چیز ہے۔ لیکن چونکہ ابھی اس رُوح کو جسم نہیں ملا جو اعمال کے صدور کا ذریعہ ہے، لہٰذا اس دَور کو موت سے تعبیر کیا گیا۔

اسی دَور کے متعلق دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ"

(الاعراف: ۱۱)

"ہم نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھاری صورتیں بنائیں۔ پھر فرشتوں سے فرمایا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔"

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ تمھاری یہ تخلیق فرشتوں کے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے پیشتر وقوع پذیر ہو چکی تھی۔

۲۔ اس تخلیق کے وقت تمھاری صورتیں بھی بنا دی گئی تھیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ رُوح بھی شکل وصورت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی تائید ان احادیثِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں مذکور ہے کہ فرشتے جب کسی نیک مسلمان کی رُوح قبض کرتے ہیں، تو اس رُوح کو ریشمی لباس میں لپیٹ کر اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس رُوح کی شکل کیسی ہوتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس رُوح کی شکل وصورت بھی بالکل وہی ہوتی ہے جو اُس کو ملنے والے جسم کی ہوتی ہے یا ہو گی جبھی تو رُوحیں بھی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ اور اس رُوح کی قالب میں مثال یُوں سمجھئے جیسے زیتون کے درخت میں روغنِ زیتون یا کوئلہ میں آگ یا جلنے والی گیس۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح کی تخلیق اور اس کو شکل وصورت عطا کرنے کے باوجود اس دَور کو عام ضابطہ کے مطابق موت کے زمانہ سے تعبیر کیا ہے اور یہی موت کی تخلیق کا مفہوم ہے۔

اب اِن چاروں مراحل کی کیفیت اس طرح ہوئی کہ:

(۱) پیدائشِ رُوح سے لے کر اُس رُوح کو مادرِ شکم میں داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) شکمِ مادر میں جسم میں رُوح کے داخل ہونے سے لے کر موت تک کا عرصہ۔ اسے زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) موت سے لے کر قیامت کو دوبارہ اجسام میں رُوح کے داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۴) قیامت کو دوبارہ جی اُٹھنے کے بعد لامتناہی مدت۔ اس عرصہ کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اب دیکھئے کہ ان چاروں ادوار میں عدم یا فنا اگر ہے تو جسم کو ہے۔ رُوح جب سے پیدا

ہُوئی۔ اُس کے معدوم یا فنا ہونے کا کوئی مرحلہ پیش نہیں آیا۔ جب رُوح اکیلی ہوتی یا رہ جاتی ہے تو اُسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو اُسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

## دُوسرا مرحلہ۔ دنیوی زندگی!

اس مرحلہ میں رُوح بدن میں داخل رہتی ہے۔ یعنی جنین میں رُوح کے داخل ہونے یا جان پڑنے سے لے کر رُوح کے جسم سے نکل جانے یا مرنے تک کا عرصہ دنیوی زندگی کہلاتا ہے۔ زندگی کہنے کا اصل سبب تو یہی ہے کہ اس عرصہ رُوح و بدن کا کلی اتصال ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتصال کلی کبھی منقطع بھی ہو جاتا ہے۔ گویا اس موت و حیات کے قانون میں استثناء کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ جن کا ذکر ہم ذرا تفصیل سے کریں گے۔ تاکہ برزخ کے مسائل سمجھنے میں آسانی ہو۔

### استثنائی صورتیں:

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عام ضابطہ یا قانونِ قدرت یا سنت اللہ یا عادتِ عامہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کے آگے مجبور و بے بس نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام قوانینِ فطرت یا قدرت کے خلاف گاہے گاہے اس کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ اور یہ بات اس آگ کی فطرت میں داخل ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت آگ کو یہ حکم دے کہ فلاں شخص کے حق میں "ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا" تو آگ کو اپنی اصلی فطرت چھوڑ کر اللہ کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ چھُری کا کام کاٹنا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے حکم سے چھُری کی اس خاصیت کو سلب بھی کر سکتے ہیں۔ مائعات کا یہ کام ہے کہ افتراق کے بعد اس کے اجزاء فوراً مل جاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اللہ تعالیٰ دریا کو یہ حکم دے کہ پھٹ کر پہاڑ کے تودوں کی طرح رک جا اور درمیان میں کشادہ راستہ بنا دے۔ تو دریا کو اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا صرف ایک قانون ایسا ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور یہ قانون قوموں کے عروج و زوال سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم بدکرداری کی انتہائی پستیوں کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ خواہ یہ تباہی جلد ہو یا بدیر۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو "سُنَّۃُ اللّٰہِ" کہا ہے۔ اور قرآن کریم میں چار مختلف مقامات پر ذکر کر کے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ اس "سنت اللہ" میں کوئی تغیر و تبدل یا لچک نہیں ہے۔

## ۱۔ احیائے موتیٰ یا اسی دنیوی زندگی میں مُردوں کا زندہ ہونا:

رہا موت وحیات کا قانون، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ تو اس میں بھی استثنائی صورتیں قرآنِ کریم سے واضح طور پر ثابت ہیں:

۱۔ حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو "قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ" کہہ کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔

۲۔ حضرت عزیرؑ کا ایک اجڑی ہوئی اور ویران شدہ بستی پر گزر ہوا تو کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ اس مُردہ بستی کو کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پورے سو سال کے لیے موت دے دی۔ پھر زندہ کر کے پوچھا۔ "اب بتاؤ کہ تم کتنا عرصہ یہاں پڑے رہے ہو؟" کہنے لگے کہ "یہی کوئی دن آدھ دن کی بات ہوگی۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "نہیں بلکہ تم تو سو سال موت کی حالت میں پڑے رہے ہو۔ ذرا دیکھو تو تمھارے سواری کے گدھے کے پنجر کے سوا اور کوئی چیز رہ گئی؟ دیکھو اب ہم تمھارے سامنے اس پنجر کو کیوں کر گوشت پوست پہنا کر کے اُسے پھر سے زندہ کئے دیتے ہیں۔" (البقرۃ: ۲۵۹)

۳۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص قتل ہو گیا۔ قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا۔ سب مشتبہ لوگ ایک دوسرے پر الزام دھر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ پھر اس مذبوح گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو۔ تو یہ لاش خود اپنے قاتل کا پتہ بتلائے گی۔ چنانچہ جب اس لاش پر مذبوح گائے کے گوشت کا ٹکڑا مارا گیا۔ تو مُردہ زندہ ہو گیا۔ اس نے باتیں کیں اور اپنے قاتل کا پتہ بھی بتلا دیا۔ (البقرۃ: ۷۳)

۴۔ حضرت موسیٰؑ جب تورات لے کر کوہِ طور سے بنی اسرائیل کی طرف واپس آئے، تو اس بدسرشت قوم نے یہ اعتراض کر دیا کہ ہمیں کیا معلوم کہ یہ کتاب واقعی اللہ کی طرف سے اتری ہے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اسے اللہ کی طرف سے اُترتے تو دیکھا نہیں۔ پھر یہ یقین کیسے ہو؟ موسیٰؑ نے قوم کے اس بے ہودہ اعتراض سے نجات کی یہی راہ دیکھی کہ اللہ تعالیٰ سے التجا کریں۔ چنانچہ وحیِ الٰہی کے مطابق اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو چُنا اور کوہ طور پر لے گئے۔ وہاں جا کر جب ان ستر آدمیوں نے اپنے مطالبہ کو دُہرایا اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور تورات کے اترنے کا منظر دیکھنے پر اصرار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ایک کڑک بھیج کر اُن سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب حضرت موسیٰؑ پھر اللہ سے التجا کرنے لگے۔ بارِ الٰہی! ان بے وقوفوں کی اس خواہش پر تُو نے انھیں مار دیا۔ اب مَیں کیسے واپس جاؤں اور قوم کو کیا کہوں؟ تو

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ" (البقرۃ: ۵۶)

"پھر ہم نے تمھیں تمھاری موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا"

نیز دیکھئے: الاعراف: ۱۵۵

۵۔ حضرت ابراہیمؑ نے محض اطمینانِ قلب کی خاطر اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کیا کہ اے میرے پروردگار تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں فرمایا کہ "یوں کرو کہ چار پرندے لے کر اُن سے خُوب مانوس ہو جاؤ تاکہ اُن کی شکل وصورت کو خوب پہچان سکو۔ پھر اُن کو ذبح کر کے اُن سب کا گوشت اچھی طرح ملا دو۔ پھر اُسے مِلے جُلے گوشت کو چار حصّوں میں تقسیم کرو اور ہر حصّہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر واپس آکر انھیں ایک ایک کر کے پکارو تو وہی پرند تمھارے پاس دوڑتا ہُوا آئے گا جسے تم پکارو گے۔ اسی طرح چاروں پرندے تمھارے بُلانے کی ترتیب کے مطابق تمھارے پاس حاضر ہوتے جائیں گے" (البقرہ: ۲۶۰)

۶۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں لوگ جہاد کے لیے نکل تو کھڑے ہُوئے لیکن دشمن کے مقابلہ اور موت کے ڈر سے اُن کی جان گویا پہلے ہی نکل رہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہیں موت دے دی، کہ جس بات سے ڈرتے ہو اس کا تو ابھی مزہ چکھو۔ پھر چونکہ اللہ تعالیٰ کو صرف عبرت دلانا مقصود تھا۔ لہٰذا اُنھیں پھر سے زندہ کر دیا۔ (البقرہ: ۲۴۳)

یہ تمام واقعات قرآنِ کریم میں بصراحت موجود ہیں۔ ہم نے کسی واقعہ کی تشریح وتفسیر اپنی طرف سے بیان نہیں کی بلکہ صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو عام قانونِ الٰہی یہی ہے کہ ہر شخص کو دوبار زندگی اور دوبار موت سے دوچار ہونا ہے۔ مگر کسی کے حق میں ۳ بار کی زندگی اور ۳ بار کی موت بھی مقدر ہو سکتی ہے۔ گو ایسے واقعات شاذ ونادر ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں، تاہم ان کے امکان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جو لوگ ایسے واقعات کی تاویلات کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ گویا خدا تعالیٰ کی جاری وساری قدرت کے منکر ہوتے ہیں۔

## ب۔ نیم زندگی (خواب) یا برزخی موت:

اب دیکھئے۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر انسان کو موت کا ہلکا سا نقشہ دکھلا دیا گیا ہے اور یہ موت نیند کی حالت ہے۔ جسے ہم برزخی موت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نیند کو موت کی بہن قرار دیا ہے۔ نیز سونے کے بعد جاگنے پر جو دُعا سکھلائی۔ یعنی

## برزخ کا لغوی مفہوم

برزخ کے معنی بالعموم پردہ یا آڑ کر لیے جاتے ہیں۔ جبکہ عربی زبان میں پردہ کے لیے اور بھی بہت سے لفظ موجود ہیں مثلاً ستر، حجاب، غطاء، غلف، اکنّۃ وغیرہ۔ اور ان سب الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق موجود ہوتا ہے۔ برزخ دراصل دو مختلف یا متضاد چیزوں کے درمیان ایک ایسی تیسری چیز کا نام ہے۔ جس میں پہلی دونوں اشیاء کے ملے جلے اوصاف پائے جاتے ہیں اور وہ آڑ کا کام بھی دے۔ خواہ یہ اوصاف برابر برابر ہوں یا کسی ایک چیز کے کم اور دوسری کے زیادہ۔ جیسے جنت اور دوزخ کے درمیان اعراف برزخ ہے۔ جمادات اور نباتات کے درمیان مرجان برزخ ہے۔ جو بڑھتا اور شاخیں تو نباتات کی طرح پھیلاتا ہے۔ مگر نوع کے لحاظ سے پتھر ہے اور جمادات میں شامل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ میٹھے اور کھاری پانی کے درمیان ایک برزخ کی رُوپیدا کر دیتا ہے جسے قرآنِ کریم میں برزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند اسی لحاظ سے برزخ ہے کہ اس میں زندگی اور موت کے ملے جلے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں غالب اثرات زندگی کے ہی ہوتے ہیں موت کے نہیں۔

## برزخی موت یا نیند

اسی نیند کے معاملہ پر غور کرنے سے رُوح کی بحث بھی شروع ہو جاتی ہے سب علماء اور اطباء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں: ایک تو رُوحِ حیوانی ہے جس کا تعلق گردشِ خون سے ہے۔ (اسی رُوح کو بعض حضرات نے نفسِ زیریں سے بھی تعبیر کیا ہے) جب تک گردشِ خون برقرار ہے یہ رگ میں موجود رہتی ہے اور اگر یہ رُوح نکل جائے تو گردشِ خون ختم ہو جاتی ہے۔

## رُوحِ انسانی یا نفس

دوسری قسم رُوحِ نفسانی ہے۔ جسے نفسِ بالا یا رُوحِ انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو خواب میں سیر کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوح کا یہ حصہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواسِ خمسہ میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوتِ باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قوتِ سامعہ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ہاں اگر غل غپاڑہ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوئے ہوئے آدمی کو آواز دے کر جگا دے تو یہ رُوحِ نفسانی دوبارہ فوراً اپنے جسم میں لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جاگنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس رُوحِ نفسانی کو اپنے قالب سے عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی قالب اس رُوحِ نفسانی کی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کبھی نفس کو مخاطب کیا ہے تو اس

سے مراد ہمیشہ ہی نفسِ بالا یا رُوحِ انسانی ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو جزو ہوتے ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے لطف اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب میں کوئی ناگوار حادثہ پیش آ جائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چیخنے چلانے لگتا ہے۔ اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں خواب میں مار پڑے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنھیں انسان جاگنے کے بعد خود بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

## رُوح سے متعلق چند حقائق

خواب سے ہر انسان کو بکثرت واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس خواب سے بھی چند ایسے حقائق کا پتہ چلتا ہے جن کے ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

۱۔ خواب میں اس رُوحِ نفسانی کی شکل وصورت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے بستر پر پڑے ہُوئے (سوتے ہوئے) اس کے قالب کی ہوتی ہے۔ اور خواب کے دوران جب رُوحیں آپس میں ملتی ہیں تو اس شکل وصورت کی ہم آہنگی کے واسطہ سے ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں۔

۲۔ ضروری نہیں کہ ان ہی رُوحوں کی آپس میں ملاقات ہو جو اس دُنیا میں زندہ کہلاتے ہیں۔ یہ ملاقات اُن لوگوں سے بھی ہو سکتی ہے جو اس جہان سے رحلت کر چکے یا مر چکے ہیں۔ زندہ کی رُوح مُردہ کی رُوح سے بھی ملاقات کر سکتی ہے اور اس کے برعکس بھی۔

۳۔ خواب میں جو واقعات رُوح کو پیش آتے ہیں، ان واقعات کے بیشتر اثرات سے اس رُوح کا مادی قالب بے بہرہ رہتا ہے۔ مثلاً ایک شخص خواب میں خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ لیکن جب جاگتا ہے تو بھوکا ہوتا ہے۔ البتہ کچھ نہ کچھ واقعات ایسے بھی ضرور ہوتے ہیں جن سے انسان کا مادی قالب بھی متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ تاہم عام قاعدہ یہی ہے کہ مادی قالب رُوحِ نفسانی سے خواب کے دوران پیش آمدہ واقعات سے متاثر نہیں ہوتا۔

۴۔ خواب میں رُوح راحت والم یعنی ثواب وعذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ مر بھی جاتی

.... ہے اور کبھی تو خواب میں زندہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی بیداری پر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواب .... میں تو مر گیا تھا مگر حقیقتاً زندہ ہے۔

یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان مشاہدات و تجربات کی وجوہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کر دے تو اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ: "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا"۔

ان ہر دو اقسام کی روحوں کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی روح کے خاتمہ سے دوسری قسم کی روح از خود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص سویا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کہ کسی دوسرے شخص نے اسے سوتے میں قتل کر دیا۔ تو روحِ نفسانی خواہ کہیں بھی سیر کرتی ہوگی۔ اب یہ دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ اسے وہیں قبض کر لے گا۔ اسی کے برعکس صورت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کی روحِ نفسانی کو خواب میں قبض کر لیں تو بستر پر سونے والا آدمی بغیر کسی حادثہ یا بیماری کے مر جائے گا۔ ارشادِ باری ہے:

"اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى"

(الزمر: ۴۲)

"اللہ تعالیٰ موت کے وقت کسی شخص کی روح کو قبض کر لیتا ہے اور اس شخص کی روح کو بھی جو خواب میں ہے اور ابھی مرا نہیں۔ پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے اُن کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو جو (خواب دیکھ رہی ہیں) ایک مقررہ وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔"

آیتِ مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے قوی دلیل ہے کہ روح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ روح جو کسی حالت میں بھی بدن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور یہ روحِ حیوانی یا نفسِ زیریں ہے۔ دوسری وہ روح جو خواب میں بدن کو چھوڑ کر سیر کرتی پھرتی ہے اور ہر طرح کے واقعات سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ روح نفسِ بالا یا روحِ انسانی کہلاتی ہے۔ اسی روح کو اللہ تعالیٰ مخاطب فرماتے ہیں۔ اور اسی روح کو دوام ہے۔

۲۔ روحِ حیوانی یا نفسِ زیریں کا تعلق محض بدن سے ہے۔ بدن نہ ہو تو اس روح کا کوئی وجود

ہی نہیں رہتا۔ بلکہ یہ رُوح تو بدن کے بوسیدہ ہونے یا فنا ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتی۔ موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، اس کے ختم ہونے سے بدن بدن نہیں کہلاتا بلکہ جسد، میت، لاش یا نعش کہلاتا ہے۔

۳- بیداری کی حالت میں یہ دونوں قسم کی رُوحیں انسانی جسم میں موجود رہتی ہیں۔ اوسطاً ہر انسان اپنی زندگی کا تیسرا حصہ وقت سو کر گزارتا ہے۔ گویا اس دنیوی زندگی کا تیسرا حصہ وقت برزخی موت ہے۔ پھر اس دنیوی زندگی میں اس برزخی موت کی حالت میں بھی زندگی کے آثار موت کے آثار سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیاوی زندگی میں تقریباً بارھواں حصہ وقت انسان پر موت کے اثرات غالب رہتے ہیں۔

## تیسرا مرحلہ

## موت سے لے کر حشر تک عرصۂ موت

چونکہ اس عرصہ میں رُوح کو بدن میسّر نہیں آتا۔ لہٰذا یہ عرصۂ موت ہے۔ مگر دنیوی زندگی کی طرح اس عرصہ موت میں بھی استثنائی صورتیں موجود ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

### ۱- عذابِ قبر

اب دیکھئے جس طرح انسان دنیوی زندگی میں موت کے اثرات سے دوچار ہوتا ہے، بعینہٖ اسی طرح عرصہ موت (مرنے کے وقت سے لے کر روزِ قیامت تک کی موت) میں زندگی کے اثرات سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو علماء نے کئی طریقوں سے واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس بات کے باوجود کہ رُوحیں سجّین اور علیین میں ہوتی ہیں۔ تاہم ان رُوحوں کا ہلکا سا تعلق اپنی اپنی قبروں سے قائم رہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان روحوں کا عکس قبر پر بھی پڑتا ہے بعض دُوسرے علماء نے اس حقیقت کو یُوں ادا کیا کہ اس عرصہ موت میں رُوح اور بدن کا انفصال کُلّی نہیں ہوتا۔ گویا رُوح اور بدن کا تعلق قائم تو مستقل طور پر رہتا ہے مگر یہ تعلق بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔

**عذابِ قبر کی حقیقت** مجھے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت عطا فرمائی ہے وہ یہ کہ:

(۱) اس عرصہ موت میں رُوح و بدن میں کلّی طور پر انفصال ہو جاتا ہے مگر جس طرح دنیوی زندگی میں بحالتِ خواب کبھی کبھار رُوح بدن کو چھوڑ جاتی ہے۔ بعینہٖ اس عرصۂ موت میں کبھی کبھی رُوح اپنے بدن سے آملتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں

انسان سونے یا آرام کرنے کے لیے کسی حد تک خود مختار ہوتا ہے۔ لیکن خواب اور اس میں رُوح کے واردات اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ جبکہ اس برزخی عالم میں کچھ بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ سب کچھ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ گویا رُوح و بدن کا یہ تعلق صرف ہلکا اور کمزور ہی نہیں ہوتا بلکہ غیر مستقل ہوتا ہے اور اضطراری بھی۔

۲۔ پھر جس طرح، ایک دن رات یا ۲۴ گھنٹہ کے عرصہ میں انسان رات کو یا کسی وقت دن کو سوتا ہے تو خواب کی صورت میں اُس کی رُوح بدن چھوڑ جاتی ہے، اسی طرح اس عرصۂ موت میں دن میں ایک دو بار اپنے قالب یا قبر کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

۳۔ پھر جس طرح خواب کی حالت میں رُوح کے بدن کو چھوڑنے کے وقت بھی حقیقتاً حیات کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں روح کی بدن سے ملاقات کے دوران بھی موت کے آثار غالب رہتے ہیں۔

۴۔ نیز جس طرح خواب میں رُوح راحت و اَلم سے دوچار ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے اثرات بدن پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصۂ موت میں رُوح کو عذاب و ثواب ہوتا ہی ہے، تاہم اس ملاقات کے دوران اس کے اثرات جسم یا اس کے ذرات پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اور یہی عذاب و ثواب کی حقیقت ہے۔

## قرآن اور عذابِ قبر

اب دیکھئے امام بخاریؒ نے قرآن کی درج ذیل آیت سے عذابِ قبر کا استشہاد کیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۚ" (المؤمن: ۴۶)

"وہ صبح و شام آگ (آتشِ جہنم) پر پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر جب قیامت برپا ہوگی تو (ہم حکم دیں گے کہ) آلِ فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔"

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ غُدُوًّا وَعَشِيًّا کے الفاظ ہمارے اسی موجودہ نظامِ شمسی کے حساب سے ہیں۔ دن بھر میں ایک دو بار عذاب پر پیش کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ رُوح اور بدن کا اتصال مسلسل نہیں ہے۔ ورنہ فرعون جیسے ظالم اور کافر کو تو قبر میں عذاب مسلسل ہی دیا جانا چاہیے تھا۔

۲۔ انھیں صرف عذاب پر پیش کیا جاتا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح خواب میں

راحت و اَلم کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے اسی طرح قبر میں عذاب و ثواب کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے۔ یعنی عذاب و ثواب کا اثر قیامت (زندگی) کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔

۳۔ البتہ قیامت کے دِن ان لوگوں کو فی الحقیقت آتشِ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ زندگی کا عرصہ ہے اور اس عرصہ میں رُوح و بدن کا تعلق مسلسل اور مستقل طور پر قائم رہے گا لہٰذا عذاب و ثواب شدید بھی ہوگا اور مستقل بھی۔

دوسری آیت جس سے امام بخاریؒ نے عذابِ قبر کا استشہاد کیا ہے۔ وہ استشہاد کی حد تک تو درست ہے مگر اس سے مسئلہ کے صرف ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

"وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ۔" (الانعام: ۹۳)

"کاش تم ان ظالموں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں۔ اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی۔"

یہ آیت درج کرنے کے بعد امام بخاری لفظ ھُوْن کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قَالَ اَبُوْ عَبْدُ اللّٰهِ الْهُوْنُ هُوَ الْهَوَانُ وَالْهُوْنُ الرِّفْقُ۔"

(بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ما جاء فی عذاب القبر)

"امام بخاریؒ نے کہا کہ ھُوْن کا معنی ھَوَان یعنی ذلت اور رُسوائی ہے۔ اور ھَوْن کا معنی نرمی اور ملائمت ہے۔"

آیت بالا اور امام صاحب کے اجتہاد سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ عذاب (و ثوابِ) قبر مرنے کے وقت سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ "الیوم" کے لفظ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

۲۔ یہ عذاب بھی گو ذلت و رسوائی کا ہوگا۔ تاہم اشدّ العذاب یا عذابِ عظیم کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوگا۔

ہمارے اس خیال کی تائید بہت سی احادیثِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں یہ مذکور ہے کہ مومن کے پاس قبر میں فرشتے آتے ہیں، تو پہلے اس پر دوزخ کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم دُنیا میں بداعمالیاں کرتے تو تمہارا ٹھکانا یہ دوزخ ہوتی۔ پھر اس پر جنت کو پیش کر کے کہا جاتا ہے

کہ چونکہ تم نے دُنیا میں اپنی زندگی احکامِ الٰہی کی اطاعت میں بسر کی ہے۔ لہٰذا اب تمہارا ٹھکانا جنت ہوگا۔ پھر جنت سے ایک روزن اس کی قبر میں کھول دیا جاتا ہے۔ اور کافر سے معاملہ بعینہٖ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

**قبر اور جدث** انسان کو جب قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے جسم کو مٹی یا کیڑے کھا جاتے ہیں۔ ہڈیاں بھی ایک مدّت بعد بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل کر مٹی بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات قبروں کے نشان تک بھی مٹ جاتے ہیں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رُوح کا یہ جزئی اتصال آخر کون سے بدن سے ہوتا ہے۔ اور جب قبر کے نشان تک مٹ کر اس پر بازار بن چکے ہیں یا کھیتی کاشت کی جا چکی ہو تو وہ قبر ہے کون سی جس میں عذاب ہوتا ہے؟

اس سے آگے چلئے بعض لوگ اپنے مُردوں کو دفن ہی نہیں کرتے بلکہ لاش کو جلا دیتے ہیں پھر اُس کی راکھ کو دریا میں بہا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی مَوت یُوں واقع ہوتی ہے کہ انھیں درندے پھاڑ کھاتے ہیں۔ اور میّت اس درندے کا جزوِ بدن بن جاتی ہے۔ بعض لوگ پانی میں ڈوب کر مر جاتے ہیں تو آبی حیوانات کی خوراک بن کر اُن کا جزوِ بدن بن جاتے ہیں۔ تو آخر وہ کون سی قبر یا بدن ہے۔ جس کے ساتھ اس عرصہ موت میں رُوح کے اتصال کا امکان باقی رہ جاتا ہے؟

اب اس سے بھی آگے بڑھیے کہ جو درندے یا آبی جانور کسی میّت کی قبر بنے ہیں۔ وہ بھی بالآخر مر کر مٹی میں مل جائیں گے۔ تو قبر یا بدن والی آخر کونسی بات رہ جاتی ہے جس سے رُوح کا اتصال ہو؟ جب ہم یہ سوچتے ہیں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان کی لاش مٹی میں مل کر مٹی کے ذرّات میں ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کلیہ میں اگر استثناء ہے تو صرف یہ کہ انبیاءؑ قبروں ہی میں دفن ہوتے ہیں۔ اور اُن کے اجساد کو مٹی نہیں کھا سکتی۔ جیسا کہ احادیثِ صریحہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کے بعد کچھ ایسے صلحاء بھی اس ضمن میں آ سکتے ہیں جن کے اجساد کو کھانا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے مگر اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ انبیاءؑ کے اجساد کو زمین کیوں نہیں کھاتی؟ یہ ایک الگ بحث ہے جو خصائص انبیاءؑ سے تعلق رکھتی ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ابتدائی صورت جب تک اس کا جسد قبر میں بحال رہتا ہے، یا پھر قبر کے نشانات قائم رہتے ہیں۔ اس حالت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قبر کا استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ" (فاطر: ۲۲)

"اے محمدؐ! آپ اُن لوگوں کو سُنا نہیں سکتے جو قبروں میں ہیں"

اور دُوسری حالت آخری حالت ہے۔ جبکہ نہ تو قبر کا نشان باقی رہ جاتا ہے اور نہ جسم کا، بلکہ وہ مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے۔ تو اس حالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے "جدث" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ" (یٰسٓ: ۵۱)

"پھر جب صُور میں پھُونکا جائے گا تو لوگ اپنی اپنی اجداث[1] سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے"

گویا قیامت کے برپا ہونے کے وقت نفخہ ثانی پھُونکا جائے گا جس کا اثر یہ ہوگا کہ مٹی میں ملے ہُوئے ذرات فوراً متحرک ہو کر آپس میں مل کر جسم کی شکل اختیار کر جائیں گے۔ پھر ان اجسام کی رُوحیں اُن میں مستقل طور پر داخل ہو جائیں گی۔ پھر یہ لوگ اپنے پروردگار کی آواز پر لبیک کہتے ہُوئے میدانِ محشر کی طرف دوڑتے ہُوئے پہنچ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

**عذابِ قبر کا عقلی ثبوت**

اب رہی یہ بات کہ جدث کی صُورت میں رُوح کا اتصال (اگرچہ وہ کبھی کبھار اور کمزور سا ہوتا ہے) ممکن بھی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہے۔ کیونکہ احادیثِ صحیحہ سے اور قرآن سے بھی عذاب و ثوابِ قبر کا دوام ثابت ہے۔ اور عقلی لحاظ سے بھی یہ ممکن ہے۔ کیونکہ جسم کے کسی ادنیٰ سے حصّے یا ذرّے پر تکلیف سے رُوح متاثر ہو جاتی ہے۔ اور اب تو سائنس کے جدید انکشافات نے اس مسئلہ کو اور بھی قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ جسم کی ساخت میں خلیات کا کردار اور اُن کا بناؤ بگاڑ۔ نیز فضا میں ازل سے پیدا شدہ انسانی اور غیر انسانی آوازوں کا محفوظ ہونا اور ان آوازوں کو الگ الگ کرنے کا امکان ایسی باتیں ہیں جو جدث سے بعث بعد الموت کے امکان کو ٹھوس ثبوت بہم پہنچا دیتی ہیں۔ اور اس بات کا بھی کہ ان ذرّات سے رُوح کے اتصال کا امکان، ممکن ہے۔

---

[1] قبر اور جدث کا یہ لغوی فرق شاید لغت کی کسی کتاب سے نہ مل سکے گا۔ یہ جو کچھ فرق میں نے بیان کیا ہے قرآن کریم کے طرزِ بیان کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## عذاب قبر کا تعلق رُوح اور بدن دونوں سے ہے

بدن یا جسم میں اگرچہ عقل و شعور اور ارادہ واختیار نہیں ہوتا لیکن چونکہ وہ ایک "آلۂ کار" کی حیثیت سے رُوح کے نیک وبد اعمال کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہٰذا اس برزخی زندگی میں وہ بھی اپنی موجودگی کی مناسبت سے عذاب وثواب میں شریک ہوتا ہے۔ اس برزخی زندگی میں رُوح تو مستقل طور پر زندہ رہتی ہے مگر بدن کو یہ پائیداری حاصل نہیں۔ لہٰذا اس عذاب وثواب کا بیشتر حصہ رُوح ہی کے حصہ میں آتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ عرصہ موت ہے۔ جس میں زندگی کے آثار جیسے کچھ بھی ہوں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیوی زندگی میں خواب جیسی نیم زندگی ہونے کے باوجود اس عرصہ کا نام زندگی ہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں زندگی کے آثار زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ مرحلہ ۲ (دنیوی زندگی) میں موت (نیند) اور مرحلہ ۳ میں برزخی زندگی کے وجود کی طرف رسول اللہ ؐ کے درج ذیل ارشاد میں پوری طرح صراحت موجود ہے۔ فرمایا:

"اَلنَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا"

"لوگ سوتے ہوتے ہیں، جب مریں گے تو اُن کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

برزخی زندگی کی حقیقت صرف اتنی ہے جتنی اس دنیا میں خواب کی ہے۔ پھر جس طرح خواب میں رُوح دُکھ سُکھ سے دوچار ہوتی ہے، اور یہ سمجھتی ہے کہ وہ فی الواقعہ مکمل طور پر اس سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن خارجی دُنیا میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ اب دیکھیے انسان دو ہی طرح کے ہیں، ایک مومن، دُوسرے کافر۔ مومن کے لیے قبر فراخ کر دی جاتی ہے اور کافر کے لیے قبر اتنی تنگ کر دی جاتی ہے کہ میّت کی ہڈیاں ایک دُوسری میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور یہ واقعات میّت کی تدفین کے فوراً بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس میّت کی قبر کو اکھاڑ کر دیکھیں گے تو قبر کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

پھر جس طرح خواب میں بعض اوقات رُوح کے علاوہ بدن بھی متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح برزخ کے عذاب وثواب میں بھی بعض دفعہ بدن پر اثر ہو جانا ممکن ہے۔ اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کبھی رُوح وبدن کا اتصال ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ مدت "موت" ہے۔

## آزمائش اور حساب کا فرق

اب رہی یہ بات کہ اگر عذاب وثواب قبر ہی سے شروع ہو جاتا ہے تو پھر آخرت میں اور کونسا حساب لینا باقی رہ جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں حساب نہیں لیا جاتا۔ صرف سرسری جانچ کی جاتی ہے۔ منکر نکیر آتے ہیں اور

تین بنیادی باتوں کے متعلق تین موٹے موٹے سوال پوچھتے ہیں۔ یہ گویا سرسری سا زبانی امتحان ہوتا ہے جس سے میت کو دُنیا میں اپنی کارکردگی اور آئندہ زندگی میں ان اعمال کے اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اسی آزمائش کے نتیجہ میں میت کو خوشی یا غمی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ قبر میں عذاب و ثواب کی حکمت یہ ہے کہ:

۱۔ مومن کو جنت دکھلا دی جاتے اور اُسے جنت کی خوشخبری دے کر نہ صرف یہ کہ اُس کے ذہنی اطمینان و انبساط کا سامان مہیا کیا جاتے بلکہ جنت کی کچھ تھوڑی بہت نعمتوں سے بھی سرفراز کیا جائے۔ اور ان نعمتوں کی نسبت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اس عرصہ موت کو زندگی سے نسبت ہے۔

۲۔ کافروں کو پہلے جنت دکھلا کر پھر دوزخ پیش کی جاتے تاکہ ان کو مزید حسرت و یاس ہو۔ اور حصہ رسدی عذاب بھی پہنچایا جاتے۔

۳۔ گنہگار مسلمان کو عذاب اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ عذاب اس کے گناہ کا کفارہ بن جائے۔ اور وہ بعث بعد الموت کے جنت میں جانے کے قابل بن سکے۔ اور اگر وہ زیادہ گنہگار ہے تو آخرت میں اس گناہوں کے بدلہ میں اس حد تک تخفیف کر دی جائے جس حد تک وہ عذاب قبر میں بھگت چکا ہے۔

اور حساب کا معاملہ آزمائش سے سخت اور شدید تر ہے۔ کیونکہ حساب اللہ تعالیٰ خود لیں گے دنیوی زندگی کا سارا ریکارڈ سامنے رکھ کر حساب لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہوگی۔ اعمال کیلئے میزان ہوگا۔ شہادتیں مہیا کی جائیں گی۔ اور یہ سب میدانِ محشر میں اس چوتھے مرحلہ میں ہوگا جس کا نام بعث بعد الممات یا اخروی زندگی ہے۔ جب رُوح اور بدن متصل ہوں گے اور عذاب و ثواب کا اثر شدید، ہمہ گیر اور دائمی ہوگا۔

پھر اس حساب یا عدالتی انصاف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو محض اللہ کے حضور پیشی اور سرسری پوچھ گچھ ہے۔ جو انصاف کے بجائے اللہ کی رحمت کو نمایاں کرتی ہے۔ لوگوں سے بالعموم اسی قسم کا حساب لیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ رعائتی نمبر دے کر بھی پاس کرتے جائیں گے۔ اور حساب کی یہی قسم "حِسَابًا يَّسِيْرًا" کہلاتی ہے۔ جس کے لیے مسلمانوں کو دُعاء سکھلائی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دن بھی انصاف پر اُتر آئیں۔ اور ہر شخص کے اعمال کو ہی جنت میں داخلہ کا سبب قرار دیا جائے تو شاید کوئی شخص بھی جنت میں داخل نہ ہو سکے۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے ڈھانپ لے۔

# (ب) سماعِ موتیٰ

سماعِ موتیٰ کا مسئلہ عذابِ قبر یا روح کی حقیقت کی طرح محض ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ ہے۔ لہٰذا قرآنِ مجید نے سماعِ موتیٰ کے تمام امکانی پہلوؤں کو پوری قوت سے ختم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات قابلِ غور ہیں:

۱۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (النحل: ۲۰، ۲۱)

"اور جنھیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود پیدا شدہ ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، اُن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔"

دوسرے مقام پر فرمایا:

۲۔ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاۗءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ (فاطر: ۲۲)

"زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تو جس کو چاہے سنا سکتا ہے لیکن اے محمدؐ تم ان لوگوں کو سنا نہیں سکتے، جو قبروں میں مدفون ہیں۔"

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

۳۔ "وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ (الاحقاف: ۵، ۶)

"اور اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اُسے جواب نہ دے سکے، بلکہ ان کو ان لوگوں کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ (روزِ قیامت) اکٹھے کئے جائیں گے تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے۔ اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے۔"

مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ غائب یا فوت شدہ لوگوں کو پکارنا ان کی عبادت کرنے کے مترادف ہے۔ بالفاظِ دیگر شرک ہے۔

۲۔ غائب یا فوت شدہ لوگ کسی کی پکار کا جواب دینا تو درکنار ان کی بات سن بھی نہیں سکتے۔
۳۔ قبروں میں پڑے لوگ زندہ نہیں ہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں۔ انھیں اپنی ذات کے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اُٹھائے جائیں گے۔
۴۔ البتہ ایک استثنائی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مُردوں کو سنوا سکتا ہے اس کے علاوہ اُن کے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

## استثنائی صورت

اب دیکھئے یہ استثنائی صورت وہی ہے جسے ہم دنیوی زندگی میں خواب کی مثال میں پیش کر چکے ہیں۔ خواب میں بھی روحیں اپنی مرضی سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ پھر جس طرح خواب میں روحیں آپس میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتی اور ایک دوسرے کی سنتی بھی ہیں لیکن سویا ہوا آدمی پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سُن سکتا۔ کیونکہ عالمِ خواب اور عالم ہے اور عالمِ دنیا اور عالم۔ اسی طرح مُردہ لوگ جو عالمِ دنیا کے علاوہ کسی دوسرے عالم (عالمِ برزخ یا عالمِ امثال) میں ہوتے ہیں، وہ دنیا کے لوگوں کی بات کیونکر سُن سکتے ہیں؟ عام ضابطہ الٰہی یہی ہے کہ مُردے کسی کی بات سُن نہیں سکتے۔

## استثنائی صورتوں کے نتائج

اب دیکھئے کہ:
(۱) دو بار زندگی اور دو بار موت ایک عام ضابطہ الٰہی ہے مگر مرحلہ ۲ میں مُردوں کا زندہ ہونا استثنار کی صورت ہے۔ جسے چند عقل پرستوں یا نیچر پرستوں کے علاوہ سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔
۲۔ اسی مرحلہ ۲ یا دنیوی زندگی میں دوسری استثنائی صورت خواب یا نیم موت ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے اور چونکہ یہ ہر شخص کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ خواب میں چونکہ موت کے اثرات بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ نیند کا عرصہ بھی حیات ہی میں شمار ہوتا ہے۔
۳۔ مرحلہ ۳ یعنی مرنے سے یوم البعث کے عرصہ کو قرآن نے موت سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس میں بھی زندگی کے ہلکے سے آثار پائے جاتے ہیں۔ قبر کے عذاب کا ثبوت قرآن سے بھی ملتا ہے۔ اور احادیثِ صحیحہ سے بھی واضح طور پر ثابت ہے۔ اس استثنائی صورت کو بھی سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ منکرینِ حدیث کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے قرآن کی آیات کی تاویل کر لی۔ اور احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اس استثنائی صورت کا

انکار کر دیا۔

۴۔ مرحلہ ۳ میں دوسری استثنائی صورت سماعِ موتیٰ ہے۔ اس کے متعلق عام ضابطہ الٰہی یہی ہے کہ مُردے سُن نہیں سکتے۔ اور استثنائی صورت یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مُردوں کو سُنا سکتا ہے۔ پھر کچھ احادیثِ صحیحہ بھی ایسی ہیں۔ جن میں یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ مُردے سُن سکتے ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں امت میں اختلاف واقع ہوا۔ اور عجب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرنِ اوّل میں بھی اختلاف موجود تھا۔ مثلاً حضرت قتادہؓ اور حضرت عائشہؓ تو سماعِ موتیٰ کے منکر تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ صحابہؓ میں اختلاف سننے کی حد تک تھا۔ یہ بات قطعاً مختلف فیہ نہیں تھی کہ وہ سن کر جواب بھی دے سکتے ہیں۔ مگر آج یہ مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ سماعِ موتیٰ کے قائلین صرف یہی نہیں کہتے کہ مُردے سُن سکتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مُردے اہلِ دنیا کی بات سُن کر جواب بھی دیتے ہیں۔ مزید برآں سائل کی حاجت برآری کرنے کی قدرت اور تصرف بھی رکھتے ہیں۔ یہ طبقہ گروہِ صوفیہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا پیری مریدی کا سلسلہ ان اعتقادات کے بغیر چلنا ممکن ہی نہیں۔ ہم سردست مُردوں کے جواب دینے اور حاجت برآری کرنے کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سماعِ موتیٰ کی حد تک ان قائلین کے دلائل کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

## سماعِ موتیٰ کے قائلین کا طریقِ استدلال

**(۱) قرآنی آیات کی تاویل** قرآنِ مجید چونکہ سماعِ موتیٰ کی سخت اور کلی تردید کرتا ہے اس لیے یہ حضرات ایسی تمام آیات کی تاویل کر جاتے ہیں۔ جو سماعِ موتیٰ کی تردید کرتی ہیں۔ مثلاً:

(ا) موتیٰ سے مراد حقیقی مُردے نہیں بلکہ دل کے مردہ یا کافر لوگ ہیں اور "ان کو سُنا نہیں سکتے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ انھیں راہِ راست پر نہیں لا سکتے اور اللہ کے سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی انھیں راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

(ب) جن بے جان ہستیوں کے پکارنے کا ان آیات میں ذکر ہے اس سے مراد بزرگ نہیں بلکہ وہ اصنام یا شمس و قمر اور مظاہرِ قدرت ہیں۔ جن کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔ یہی وہ

چیزیں ہیں جو نہ سن سکتی ہیں نہ جواب دے سکتی ہیں۔ اور بے جان اور بے شعور ہیں۔ رہے بزرگ تو ان کی زندگی میں جب اُن کی پرستش ہی نہیں ہوئی تو ان آیات سے یہ بزرگ کیسے مراد لئے جا سکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

**تاویلات کا جائزہ** یہ تو واضح ہے کہ آج تک عبادت یا تو بتوں کی ہوتی رہی ہے یا مظاہرِ قدرت کی جیسے شمس و قمر، ہوا، پانی، آگ، اشجار و درخت وغیرہ یا جنوں اور فرشتوں کی یا پھر فوت شدہ بزرگوں کی۔ یہ بزرگ گو اپنی زندگی میں اپنی عبادت سے منع کرتے رہے مگر جب لوگوں نے اُن کی وفات کے بعد اُن کی قبروں پر پکارنا شروع کیا تو اُن کی اسی پکار کو قرآن نے عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ عبادت کا مطلب صرف پوجا پاٹ نہیں ہوتا بلکہ کسی کو نفع پہنچانے یا نقصان سے بچانے کے لیے پکارنا بھی عین عبادت اور اس میں شامل ہے۔ اور بالعموم انہی دو باتوں کے لیے کسی کو پکارا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ:

۱۔ آیت ۱ میں "اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ" کا اطلاق نہ جنوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر، اور الفاظ "یُبْعَثُوْنَ بعد الموت" کا اطلاق بتوں یا دیگر مظاہرِ قدرت پر نہیں ہو سکتا۔ اب باقی صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

۲۔ آیت ۲ میں گو موتیٰ سے مراد مُردہ ضمیر کافر بھی لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس آیت یا سیاق و سباق میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر یہ مجازی معانی اختیار کیے جائیں۔

۳۔ آیت ۳ میں "وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ" کے الفاظ کو جنوں اور فرشتوں کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں کیونکہ وہ دعا سن سکتے ہیں۔ اور "كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً" کے الفاظ بتوں اور مظاہرِ قدرت کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان بے جان اشیاء کی نہ اس دنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ ہے نہ آخرت میں اُن کی دشمنی کا کچھ نقصان۔ بلکہ ان چیزوں کا تو آخرت میں کوئی وجود ہی نہ ہوگا۔ اب صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں۔ جو اس آیت کا صحیح مصداق بن سکتے ہیں۔

**(۲) احادیثِ صحیحہ** احادیثِ صحیحہ کے ملخص کے طور پر چار باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ نبی اکرمؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا۔

۲۔ قلیبِ بدر کا واقعہ۔

۳۔ مُردے کا تدفین کے بعد واپس جانے والوں کے قدموں کی چاپ سننا۔ اور

۴۔ قبرستان میں جاکر مسلمانوں کو "السلام علیکم دار قوم مؤمنین" وغیرہ کہنے کا ارشاد نبویؐ۔ ان باتوں میں سماعِ موتیٰ کا احتمال موجود ہے۔ گویا احادیثِ صحیحہ چونکہ قائلین اور منکرینِ سماع کے درمیان مشترک ہیں۔ لہٰذا ان کا ذکر ہم منکرینِ سماعِ موتیٰ کے دلائل میں پیش کریں گے۔

**(۳) تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث** ایسی احادیث میں سماعِ موتیٰ کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اور یہی احادیث دراصل سماعِ موتیٰ کے قائلین کے لیے رُکنِ شدید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ احادیث تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہیں، جو قابلِ احتجاج نہیں ہوتیں۔ ان سے کوئی حکم ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان پر تبصرہ کرنا بیکار اور خارج از بحث ہے۔ اس طرح کی ایک دو احادیث کا ذکر آئندہ چل کر آئے گا۔ جو ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود بہت مشہور ہیں۔

**(۴) بزرگوں کے اقوال** بزرگوں کے اقوال نے تو سماعِ موتیٰ کی بنیاد پر ایک قصرِ عظیم تیار کر دیا ہے۔ یہ بزرگ مُردوں کو یوں زندہ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ اُن کی کرامات کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ مُردوں کو زندہ کرنے کا امکان ہے مگر ان حضرات نے تو اس امکان کو اتنا عام کیا کہ عام عنا بطہ اور استثنا میں کوئی فرق ہی نہ چھوڑا۔ مولانا مودودی صاحبؒ نے کہا تھا کہ مسلمان کی عادت سی بن گئی ہے کہ جہاں انھیں سُوئی کے ناکہ جتنی گنجائش ملی وہاں سے وہ ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال ان لوگوں کی بھی ہے۔ سماعِ موتیٰ، حاجت برآری اور تصرفاتِ امور میں اُن کا دخل، اللہ تعالیٰ سے کسی صورت کم تر نہیں ہوتا۔ اگرچہ زبان سے وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ قرآن و سنت کے متبع ہیں۔ یہ مباحث اس موقع پر خارج از بحث ہیں۔ سردست ہم یہی عرض کرنا چاہتے ہیں، کہ بزرگوں کے ان اقوال اور خوابوں کو ان کے بعض معتقدین بھی حجت نہیں سمجھتے۔ تو ان کو زیرِ بحث لانا بالکل بیکار ہے۔

## منکرینِ سماعِ موتیٰ اور انکے دلائل

**۱۔ قرآن** قرآن میں مذکورہ بالا تین آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں[1] سے

[1] ان کا ذکر ہم نے اپنی تصنیف "اسلام اور رہبانیت" میں تفصیل سے پیش کر دیا ہے

سماعِ موتیٰ کا رد ثابت ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم یوں کہیں گے کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق مرحلہ ۳ یعنی برزخی زندگی میں مُردوں کے متعلق عام ضابطہ الٰہی یہی ہے کہ وہ سُن نہیں سکتے۔ اس طرح کی مزید آیات کا اندراج طوالت کا باعث ہوگا۔ مقصد برآری کے لیے یہی تین آیات کافی ہیں، جو درج کی جا چکی ہیں۔

## ۲- احادیثِ صحیحہ

**(۱) مقتولینِ بدر** قلیبِ بدر یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقتولینِ بدر کے خطاب کا واقعہ تقریباً تمام کتبِ صحاح میں موجود ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف صحیح بخاری سے تین روایات نقل کریں گے (ایک حدیث کے راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ دوسری کے حضرت قتادہؓ اور تیسری کی حضرت عائشہؓ) تاکہ معاملہ کے سب پہلو سامنے آجائیں۔ امام بخاریؒ نے یہ احادیث کتاب المغازی (غزوۂ بدر) میں درج فرمائی ہیں۔ اور کتاب الجنائز باب ماجاء فی عذاب القبر میں بھی۔

(ا) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں:

"اِطَّلَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أَهْلِ الْقَلِيْبِ فَقَالَ: "وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ كُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَقِيْلَ لَهٗ أَتَدْعُوْ أَمْوَاتًا۔ قَالَ: مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لَا يُجِيْبُوْنَ"

"جو کافر بدر کے دن اندھے کنویں میں ڈال دیئے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر جھانکا اور فرمایا "تمہارے مالک نے جو سچا وعدہ تم سے کیا تھا وہ تم نے پالیا؟" لوگوں نے عرض کیا "آپ مُردوں کو پکارتے ہیں؟" فرمایا "تم کچھ اُن سے زیادہ نہیں سنتے۔ البتہ وہ جواب نہیں دے سکتے"

(ب) حضرت قتادہ، انس سے اور وہ ابوطلحہ انصاری سے یہی واقعہ روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

قَالَ قَتَادَةُ: أَحْيَاهُمُ اللّٰهُ حَتّٰى أَسْمَعَهُمْ قَوْلَهٗ تَوْبِيْخًا وَّتَصْغِيْرًا وَّنِقْمَةً وَّحَسْرَةً وَّنَدَمًا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی، ابواب غزوۂ بدر)

"قتادہ نے اس حدیث کی تفسیر میں یہ کہا کہ اللہ نے اُس وقت اُن مُردوں کو جِلا دیا

تھا، اُن کو زجر و توبیخ کرنے، ذلیل کرنے، بدلہ لینے، افسوس دلانے اور شرمندہ کرنے کے لیے؟

(ج) حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم یا اس اجتہاد کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ عبداللہ بھول گئے۔ (نسائی۔ کتاب الجنائز۔ باب عذاب القبر)

اور خود اس واقعہ کے متعلق فرمایا:

"قَالَتْ "اِنَّمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهُمْ لَيَعْلَمُوْنَ الْاٰنَ اَنَّ مَا كُنْتُ اَقُوْلُ لَهُمْ حَقٌّ وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى؟ (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کافروں کو صرف یہ کہا تھا کہ: میں جو ان سے کہا کرتا تھا اب ان کو معلوم ہو گا کہ وہ سچ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ روم میں) فرمایا کہ اے پیغمبر تو مُردوں کو سنا نہیں سکتا؟

ان بر سہ احادیث سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے۔ گو انھوں نے بھی اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے۔ تاہم اُن کا یہ عمل تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کے حجرہ کے باہر کھڑے ہو کر رسول اللہؐ پر، حضرت ابوبکرؓ پر اور اپنے باپ حضرت عمرؓ پر سلام کہتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے۔

۲۔ گو آپؓ سماعِ موتیٰ کو درست سمجھتے تھے، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ "وہ جواب نہیں دے سکتے"۔ گویا اُن کے نزدیک بھی یہ سلام، سلامِ دعا یا "سلامتی کی دعا" تھا، سلامِ تحیۃ نہ تھا، جس کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

۳۔ حضرت قتادہ اس واقعہ کو نبی اکرمؐ کا معجزہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کافروں کی زجر و توبیخ اور حسرت و ندامت دلانے کے لیے کہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحیں لوٹا دیں، تاکہ وہ یہ الفاظ سُن لیں۔ یا اللہ نے براہِ راست اُن کی روحوں تک یہ الفاظ پہنچا دیئے۔

۴۔ حضرت عائشہؓ سماعِ موتیٰ کی اس حد تک انکاری ہیں کہ آپؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم کا رد بھی کیا۔ آپؓ بھی اس واقعہ کو ایک معجزہ قرار دیتی ہیں۔ اُن کے خیال میں

ان مُردوں کو سنا دینا اللہ کا کام ہے۔ اور اس کی توجیہ وہی بیان فرمائی جو حضرت قتادہ نے فرمائی۔

## حضرت عائشہ رضؓ کا تفقّہ

اب دیکھئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک تہجّد گزار، زاہد، متقی اور صالح انسان ضرور تھے۔ مگر تفقّہ میں انھیں وہ مقام حاصل نہ تھا جو حضرت عائشہؓ کو حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ مسائل دریافت کرنے آتے تھے۔ ترمذی کی درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

"عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَا اشْتَکَلَ عَلَیْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَدِیْثٌ قَطُّ فَسَاَلْنَا عَائِشَۃَ اِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَھَا مِنْہُ عِلْمًا" (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب مناقب ازواج النبیؐ)

"ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ جب بھی ہم اصحابِ رسول اللہ میں کسی حدیث کے متعلق اشکال پیدا ہوتا تو ہم اُسے حضرت عائشہؓ سے حل کرانے کو آتے تو ہمیشہ آپؓ کے پاس اس حدیث کا علم پایا کرتے۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کے متعلق فرمایا:

"خُذُوْا شَطْرَ دِیْنِکُمْ مِنَ الْحُمَیْرَاءِ"

(لغات الحدیث لفظ حمر کے تحت از علامہ وحید الزمان)

"اپنے دین کا آدھا حصّہ حمیرا (حضرت عائشہؓ) سے سیکھو۔"

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تفقّہ کا یہ حال تھا کہ جب حضرت عمرؓ سے اُن کے بارے میں خلیفہ نامزد کر جانے کو کہا گیا تو آپؓ نے فرمایا:

"کیا میں ایسے شخص کو خلیفہ نامزد کر جاؤں جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا طریقہ بھی نہیں آتا!" (بخاری۔ کتاب الاحکام)

اس تقابل سے نعوذ باللہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شان کو کم کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ آپؓ کو خود رسول اللہ نے "صالح آدمی" کہا اور تہجّد پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اُن کی یہ فضیلت اپنے مقام پر ہے لیکن جہاں تک قوتِ اجتہاد کا تعلق ہے، حضرت عائشہؓ کا مقام اُن سے بہت بلند تھا۔

گویا حضرت عائشہؓ کے اجتہاد کے مطابق رسول اللہ کے یہ کلمات زجر و توبیخ اور حسرت و

افسوس دلانے کے طور پر کہے۔ جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو دریا میں تیرنے سے منع کرتا ہے۔ مگر بیٹا اُس کام سے باز نہ آئے اور دریا میں ڈوب کر مر جائے۔ پھر اُس کی لاش باپ کے سامنے آئے تو بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکل جاتا ہے کہ میں نے تجھے نہ کہا تھا کہ یہ کام نہ کرنا ورنہ مر جاؤ گے۔ گویا یہ کلمات زجر و توبیخ کے طور پر رسول اللہ نے کہے اور اعجاز کے طور پر اللہ نے یہ کلمات اِن مقتولینِ بدر کو سُنوا دیئے۔

## ۲۔ اہلِ قبور کو السلام علیکم کہنا

احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ "مُسلمان جب قبرستان جائیں تو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ" یا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ" کہیں۔ یہی وہ دلیل ہے جو سماعِ موتیٰ کے قائلین کی طرف سے بڑے شدّ و مدّ سے پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی خاص واقعہ سے بھی متعلق نہیں۔ سماعِ موتیٰ کا انکار کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ یہ سلام، سلامتی کی دُعا ہے، سلامِ تحیّۃ ہے ہی نہیں جو سُنا جا سکتا ہو اور جس کا جواب دینا فرض ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت عائشہؓ کا بھی یہی موقف تھا۔ اس کی مثال بھی یونہی سمجھئے جیسے تشہد میں رسول اللہ پر سلام پڑھا جاتا ہے۔ یا کوئی خط لکھنے والا ابتداء میں "السلام علیکم" سے خطاب کرتا ہے۔ اس سلام کا فوری جواب دینا تو درکنار، جواب دینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ کوئی جواب آجاتا ہے کبھی نہیں آتا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب رسول اللہ پر بھیجا ہوا سلام بھی آپ خود نہیں سُنتے بلکہ فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام مُسلمانوں پر بھیجا ہوا سلام از خود اُن تک پہنچ جائے اور وہ اُسے سُن سکیں۔ ایسے سلام بھی بذریعہ خدا تعالیٰ ہی اُن تک پہنچتے ہیں۔

## ۳۔ جُوتوں کی چاپ

دُوسرا واقعہ جس سے سماعِ موتیٰ کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ "جب میت کو اس کے عزیز و اقارب دفن کر کے واپس جانے لگتے ہیں تو مُردہ ان کے جوتوں کی چاپ سُنتا ہے۔"

یہ واقعہ بھی بہ تکرار احادیثِ صحاح میں موجود ہے۔ امام بخاریؒ نے اسے "کتاب الجنائز باب ماجاء فی عذاب القبر" میں دو مقامات پر اس طرح درج فرمایا ہے:

"اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا مَاتَ عَبْدٌ وُّضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ تَوَلّٰى عَنْهُ أَصْحَابُهٗ إِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ .... (الحدیث)

"رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی شخص مرتا ہے اور اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اُسے چھوڑ کر جانے لگتے ہیں تو وہ اُن کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے۔ اس وقت اُس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے بٹھلا دیتے ہیں پھر کہتے ہیں"..... (الحدیث)

اب مشکل یہ ہے کہ مُردہ کے جوتوں کی چاپ سُننے کا واقعہ بخاری کے علاوہ دوسری کُتبِ صحاح میں جہاں بھی مذکور ہے تو ساتھ ہی منکر نکیر کے آنے اور سوال و جواب کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ گویا منکر نکیر کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اُس کی رُوح علیین یا سجین سے لوٹا کر اُسے ہوش میں لایا جاتا ہے، تاکہ وہ سوالوں کے جواب دے سکے۔ اب یہ سوال و جواب کا واقعہ تو ایک اضطراری امر ہے اور خاص اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پھر کسی حدیث میں یہ بھی مذکور نہیں کہ وہ ان اصحاب کی باتیں بھی سنتا ہے تو اس خاص واقعہ سے علی الاطلاق سماعِ موتیٰ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

اور دُوسری مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ سے بھی حسرت و افسوس کا احساس دلانے کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی جب عزیز و اقارب میت کو دفن کر کے چلے جاتے ہیں، تو اُسے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ جن عزیز و اقارب کی وجہ سے تُو مارا مارا پھرتا تھا، حتیٰ کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہیں کرتا تھا۔ دیکھ وہ اب تجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لہٰذا اُسے صرف جانے والوں کی آہٹ تو سُنا دی جاتی ہے، آنے والوں کی نہیں۔ اور نہ ہی قبر پر موجود لوگوں کی گفتگو اُسے سُنائی جاتی ہے نہ ہی وہ سُن سکتا ہے۔

## ۴۔ حضورِ اکرم پر صلوٰۃ و سلام

(۱) لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا وَلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا وَصَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلٰوتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ"

"اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ (یعنی اُن میں نفل و نوافل پڑھا کرو) اور میری قبر کو جشنِ اجتماع نہ بناؤ اور مجھ پر درود پڑھا کرو۔ کیونکہ تمہارا درود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے جہاں کہیں تم ہو (یعنی قبر کے نزدیک ہو یا دُور)۔

اور نسائی میں اس درود کو پہنچانے کی تفصیل یُوں بیان کی گئی کہ:

(۲) "إِنَّ لِلّٰهِ مَلٰئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْأَرْضِ يُبَلِّغُوْنِيْ مِنْ أُمَّتِيَ السَّلَامَ"

"اللہ تعالیٰ نے رُوئے زمین پر سیّاح فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو میری اُمت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔"

اسی طرح دوسری کتبِ احادیث میں بھی ایسی روایات موجود ہیں۔ جو باوجود اختلافِ الفاظ کے اس مضمون میں مشترک ہیں، کہ "اُمت کا صلوٰۃ وسلام فرشتوں کے ذریعہ نبی اکرمؐ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ چاہے کہیں سے بھی پڑھا جائے۔"

یہ سب احادیث سماعِ موتیٰ تو درکنار، اس کا خلاف ثابت کر رہی ہیں۔

علاوہ ازیں ایک روایت مشکوٰۃ (کتاب الصلوٰۃ علی النبی بعد التشہد فصل ثانی بحوالہ ابوداؤد اور بیہقی فی الدعوات الکبیر) یوں بھی آئی ہے:

۳۔ مَامِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ۔

"جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے۔ اللہ میری رُوح مجھ پر لوٹا دیتا ہے حتیٰ کہ میں اُس کا جواب دیتا ہوں۔"

اس حدیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ رسول اللہؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے)۔ آپؐ کی رُوح اعلیٰ علیین میں ہے، جہاں سے وہ سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے۔ اگر آپؐ قبر میں زندہ ہوں تو رُوح کے لوٹائے جانے کا کچھ مطلب نہیں نکلتا۔

۲۔ رُوح سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے سلام سننے کے لیے نہیں۔ کیونکہ مندرجہ بالا احادیث کی رُو سے سلام تو آپؐ کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچا ہی دیا جاتا ہے۔ آپؐ اِن جمع شدہ سب سلاموں کا جواب اس صورت میں دیتے ہیں کہ آپؐ کی رُوح قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اور آپؐ جواب دیتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہؐ اور عام افرادِ اُمت میں فرق یہ ہے کہ انبیاءؑ کے جسم مٹی پر حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ اور یہ بات خصائص انبیاءؑ میں سے ہے۔ پھر جب آپؐ پر سلام و جواب کی یہ صورت ہو تو دوسروں پر اگر سلام پڑھا یا دعا کی جاتے تو اُن کا سننا اور جواب دینا ناممکن نظر آتا ہے۔ علی الاطلاق سماعِ موتیٰ کا قبول کرنا پھر بھی محال ہے۔

**سلامِ تشہد** اب رہا وہ سلام جو نماز میں تشہد کے دوران پڑھا جاتا ہے تو یہ سلام خطاب یا سلام تحیہ ہے ہی نہیں۔ نہ ایسے سلام کو حضورؐ نے سنا، نہ کبھی اس کا جواب دیا۔

نہ نماز میں نہ نماز کے بعد۔ حتیٰ کہ جب صحابہؓ سیکھنے کی غرض سے اونچی آواز سے یہ سلام رسول اللہؐ کے سامنے پڑھتے یا "السلام علیک ایہا النبی" کہتے تھے۔ تب بھی آپؐ نے اس کا کبھی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ یہ سلام بطورِ حکایت پڑھا جاتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب رسول اللہؐ کی ذات ہے۔ واقعہ معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ" اور اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا۔ "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ" تو یہ کلمہ بعینہٖ نماز میں بطورِ حکم پڑھا جاتا ہے۔ یہ سلام دعا کے طور پر ہے جس کا سننے سنانے یا جواب دینے سے کوئی تعلق نہیں۔

**موضوع احادیث**

اس کے علاوہ بیہقی فی شعب الایمان میں ایک روایت یوں بھی آئی ہے۔ جو عوام میں مشہور ہے، نیز یہ حدیث مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی النبی فصل ثالث میں بھی درج ہے:

"مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُہٗ"

"جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر سلام پڑھے تو میں اس سلام کو سن لیتا ہوں۔"

یہ روایت موضوع یا من گھڑت ہے۔ اس کا راوی محمد بن مروان السدی کذاب اور وضاع ہے۔ جس کا کام ہی جھوٹی حدیثیں گھڑنا تھا۔ امام بیہقی نے اسی وضاع سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جو اس روایت کی خود ہی تردید کرتی ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

"مَا مِنْ عَبْدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ اِلَّا وَکَّلَ اللّٰہُ بِہٖ مَلَکًا یُبَلِّغُنِیْ"

"جب بھی کوئی شخص میری قبر کے پاس کھڑے ہو کر مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس سلام کو میرے پاس پہنچا دیتا ہے۔"

گویا اصل مابہ النزاع مسئلہ کا اس وضاع نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ اس کی دوسری حدیث چونکہ دوسری صحیح احادیث کے مطابق ہے لہٰذا فرمانِ نبویؐ "اِنَّ الْکَذُوْبَ قَدْ یَصْدُقُ" کے مصداق اسے صحیح قرار دیا جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ سلام خواہ قبر پر پڑھا جائے یا دور سے۔ آپؐ کو فرشتوں ہی کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔

**نقد و نظر**

واضح رہے کہ:

(۱) صحیحین کی احادیث اوّل درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ باقی صحاح کی چار کتابوں کی احادیث دوم درجہ کی اور باقی کتبِ احادیث کی روایات علی قدرِ مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی اکثر احادیث ناقابلِ اعتماد ہیں۔

۲۔ مشکوٰۃ حدیث کی مستقل کتاب نہیں۔ بلکہ مختلف کتبِ احادیث سے منتخب مجموعہ ہے۔ اس کی تدوین پہلے امام حسین بن مسعود البغوی نے ۵۱۶ھ میں کی۔ اور اس کا نام مصابیح السنۃ تجویز کیا۔ اس میں ہر باب کی دو فصلیں رکھیں۔ پہلی فصل میں صحیحین کی احادیث درج کیں۔ اور دوسری میں باقی چار صحاح کی کتابوں کی۔ پھر امام محمد بن عبداللہ الخطیب نے آٹھویں صدی میں اس کو از سرِ نو مدوّن کیا۔ اس کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا۔ اور اس میں ہر باب کے بعد ایک تیسری فصل کا اضافہ کیا۔ اور اس میں بلا امتیاز جو حدیث ملی، درج کردی۔ خواہ یہ درجہ اوّل یا دوم سے تعلق رکھتی ہو اور پہلے درج نہ ہوئی۔ اور خواہ یہ حدیث درجہ سوم اور چہارم سے تعلق رکھتی ہو۔

۳۔ حدیث نمبر ۳ (ردّ اللہ علیّ روحی) میں بیہقی کے ساتھ چونکہ ابوداؤد کا حوالہ بھی آگیا ہے۔ لہٰذا یہ تو فصلِ ثانی میں درج کردی گئی اور موضوع حدیث نمبر ۱ کا فصلِ ثالث میں اندراج بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث ناقابلِ اعتماد ہے۔

۴۔ مشکوٰۃ المصابیح کی عربی شرح مرعاۃ المفاتیح محمد عبدالسلام مبارک پوری نے لکھی ہے۔ انھوں نے حدیث نمبر ۹۳۰ (یعنی ہماری مندرجہ حدیث نمبر ۳) پر جو حواشی لکھے ہیں، ان کا ملخص یہ ہے۔ (مرعاۃ المفاتیح جزء ثانی مطبوعہ مکتبہ اثریہ سانگلہ ہل ص۵۰۲، ص۵۰۳):

ا۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ سلام نزدیک سے دور یا دنیا کے کسی حصہ سے آپؐ پر بھیجا جائے وہ تمام صحیح اور مشہور احادیث کے مطابق فرشتوں کے ذریعہ آپؐ تک پہنچایا جاتا ہے۔

ب۔ میرے (شارح کے) خیال میں راجح بات یہ ہے کہ یہ سلامِ دعا ہے سلامِ تحیہ نہیں۔

ج۔ اس حدیث "سمعتہ" والی کی سند یوں ہے۔ العلاء بن عمرو۔ محمد بن مروان السدی۔ اعمش۔ ابی صالح۔ ابی ہریرہؓ مرفوعاً۔

عقیلی کہتے ہیں کہ:

۱۔ اعمش والی حدیث کا کچھ اصل نہیں۔
۲۔ العلاء بن عمرو کے متعلق ابنِ حبان اور الازدی نے کہا کہ یہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ اور
۳۔ محمد بن مروان السدی متروک الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔

**موضوع حدیث نمبر ۲** | ابنِ عبدالبر نے الاستذکار والتمہید میں ابنِ عباسؓ سے

روایت کیا کہ:

"مَامِنْ اَحَدٍ یَمُرُّ بِقَبْرِ اَخِیْهِ الْمُؤْمِنِ کَانَ یَعْرِفُهٗ فِی الدُّنْیَا فَیُسَلِّمُ عَلَیْهِ اِلَّا عَرَفَهٗ وَرَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ"

"کوئی بھی شخص جو اپنے مومن بھائی کی قبر پر گزرتا ہے جسے وہ دنیا میں پہچانتا تھا۔ جب یہ گزرنے والا شخص اس کو سلام کہتا ہے تو وہ اسے پہچان لیتا ہے اور وہ سلام کا جواب دیتا ہے۔"

اور اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث ابن ابی الدنیا نے زید بن اسلم سے۔ ابو ہریرہؓ سے کتاب القبور میں یوں بیان کی:

"اِذَا مَرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرٍ یَعْرِفُهٗ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ رَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ وَعَرَفَهٗ وَاِذَا مَرَّ بِقَبْرٍ لَّا یَعْرِفُهٗ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ رَدَّ عَلَیْهِ"

(مرعاۃ المفاتیح۔ ج ۲۔ ص۵۰۲ سے نقل کی گئی)

## عُلمائے دین اور سماعِ موتیٰ

اس حدیث کے متعلق مستفسر ۱ جناب عبدالقادر سومرو نے استفسار فرمایا۔ یہ حدیث امام ابن تیمیہؒ نے "کتاب الوسیلہ" (مترجم ص۳۳۱) میں درج فرمائی۔ اور امام ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "کتاب الروح" کے پہلے باب میں ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ (کتاب الروح۔ ترجمہ از محمد داؤد راغب رحمانی، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ص۲۵) اس حدیث کے مردود ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس کتاب کے مترجم ابو داؤد راغب رحمانی نے اسی کتاب کے ص۲۲ پر ضروری بات ۲۲ کے تحت یہ صراحت فرمادی کہ "ابن ابی الدنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابلِ قبول ہیں"۔ لطف کی بات ہے کہ ایک صفحہ پر مترجم یہ ضروری بات لکھتے ہیں۔ اور سامنے صفحہ پر ہی ابن ابی الدنیا کی یہ روایت مل جاتی ہے۔ جس سے امام ابن قیم نے احتجاج کیا ہے۔

مستفسر ۲ جناب محمد احسان الحق صاحب نے یہ سوال بھی (سوال ۲) کیا تھا کہ "کتاب الروح (ابن القیم) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ امام ابن قیم اور ان کے استاد جناب امام ابن تیمیہؒ دونوں بزرگ نہ صرف یہ کہ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے۔ بلکہ اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے تھے۔ جنھوں نے اس مسئلہ کو اچھالا اور ضعیف اور موضوع احادیث کا سہارا لے کر اس مسئلہ کو علی الاطلاق ثابت کرنا چاہا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور امام قیمؒ دونوں صاحبِ کشف و کرامات

بھی تھے۔ اور دونوں بزرگوں نے تصوف و سلوک پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اگر اس حلقہ کے نیچے سے قبر اور سماعِ موتیٰ کے مسئلہ کو کھینچ لیا جائے تو اُن کے پاس باقی رہ کیا جاتا ہے؟

اسی طرح کے ایک تیسرے بزرگ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ یہ تینوں بزرگ جب شرک و بدعات کی تردید پر قلم اٹھاتے ہیں، تو جی عش عش کر اٹھتا ہے۔ اور ہم دل و جان سے اُن کی دینی خدمات کے معترف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ زیارات قبور کے آداب اور کشف کے طریق بتلانے لگتے ہیں تو یہ نہیں سوچتے کہ آیا قبروں اور مزارات کے وجود کا بھی کوئی جواز ہے یا نہیں یا قبروں پر اس غرض سے بیٹھنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ مُردوں کو سُنانا اور اُن سے سُننا تو دُور کی باتیں ہیں۔ ان سب باتوں کی کتاب و سنت نے پُرزور تردید کر دی ہے۔ (جاری ہے)


ردِّ تقلید اور حدیث کے

# حجیتِ حدیث

حجتِ شرعیہ ہونے پر

## شیخ ناصر الدین البانی کی مایۂ ناز کتاب

ترجمہ

حافظ عبدالرشید اظہر

ضخامت ۵۵ صفحات	قیمت ۹ روپے صرف

ناشر: ادارہ محدث ۹۹ ۔ جے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ ۱۴


گزشتہ ماہ نومبر ۸۳ء میں جن احباب کے نام آنے والے رسالہ پر "اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہے" مہر لگائی گئی تھی، اپنا زرِ سالانہ جلد بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ یا وی پی وصول کرنے کے لیے تیار رہیں۔ شکریہ! (منیجر)